انّ الدین عنداللہ الاسلام

صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی صاحب رحمت مآب طاب ثراہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ وَھُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِیْنَ۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔

دین کا تصور اسلام میں وہ نہیں ہے جو دیگر ادیان میں ہے۔ یعنی عبد و معبود کے درمیان رابطہ۔ کچھ حمد و ثناء کے الفاظ کچھ آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار جس سے برتر و باکمال ہستی کی پرستش اور عظیم ترین ذات کے سامنے سر جھکانے اور کسی مرکز حسن و جمال کی طرف جذب وکشش کا فطری جذبہ تسکین پالے بس مذہب کا کام ختم ہوگیا۔ اب دنیاوی امور سے دین کا کیا تعلق تم کیونکر تجارت کرتے ہو۔ تم کس طرح زراعت کرتے ہو۔ تمہارے روابط اور تعلق دوسرے انسانوں سے کیسے ہیں۔ اس کا کوئی ربطہ مذہب سے نہیں۔

لیکن اسلام تمام ادیان وملل میں وہ منفرد دین ہے جو زندگی کے ہر گوشے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور نظام زندگی کا نام ہے۔ جس میں تہذیب نفس، تدبیر منزل اور سیاست مون سب ہی سمت آتے ہیں۔ وہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ اللہ کی عبادت اور بے نیاز کے سامنے سر نیاز جھکانے کا کیا انداز ہونا چاہئے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیا میں زندگی کیونکر بسر کرنا چاہئے۔ بلکہ اسلام کی عبادتوں میں بھی اجتماعی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے کوئی رابطہ نہیں۔ ان کا یہ خیال دیگر مذاہب کے متعلق تو درست ہے لیکن اسلام کے سلسلہ میں یہ نظریہ غلط ہے۔

اسلام بتاتا ہے کہ تمہارا نظام حکومت کیسا ہونا چاہئے۔ عدلیہ کے کیا فرائض ہیں۔ انتظامیہ کے لئے کیسے لوگوں کا انتخاب ہو، افراد و شخاص کا حکومت سے کیسا رابطہ ہو، حاکم کے کیا صفات ہوں اور نظام اسلامی کو نافذ کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ اگر سیاست کا دین سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو خاتم النبیین مدینہ منورہ کو مرکز اسلام قرار دے کر سلطنت وحکومت کی بنیاد نہ رکھتے۔ رسولؐ کے بعد اسلام میں کسی نزاع اور اختلاف کی گنجائش نہ تھی کس نے روکا تھا امیر المومنین کو کہ خود نماز نہ پڑھیں یا دوسروں کو یہ نہ بتائیں کہ کیونکر نماز پڑھی جائے۔ بلکہ تاریخ سے تو پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی مسئلہ حل نہ ہو پاتا تھا اور حاکم وقت کو اپنی قوت فیصلہ کے قصور کا اعتراف کرنا پڑتا تھا تو مجبوراً امیر المومنین کے دروازے پر آنا پڑتا تھا۔ امیر المومنین وفات رسالت کے بعد اپنے کسی حق کا مطالبہ فرما رہے تھے۔ اگر سیاست اور مذہب میں کوئی ربط نہیں تو مجلس شوریٰ میں حضرت علی نے شرکت کیوں منظور فرمائی۔ اور چوتھے دور میں خلافت کے لئے کیوں منظوری دی۔ کیا یہ رسالت مآبؐ کی روحانی، دینی

اور علمی خلافت تھی جو علیؑ کو چوتھے دور میں حاصل ہوئی۔

جی نہیں شیعوں کے نزدیک رسول کی روحانی نیابت اور دینی قیادت کبھی علیؑ کی ذات سے جدا ہوئی ہی نہیں یہ صرف سلطنت وحکومت تھی جو خلیفہ ثالث کے بعد امیر المومنینؑ تک منتقل ہوئی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ امام زین العابدینؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک آٹھ امام بالکل گوشہ نشین نظر آتے ہیں۔ آٹھویں امام حضرت امام علی رضاؑ نے بدرجہ مجبوری ولی عہدی قبول کی تو اس شرط کے ساتھ کہ امور سلطنت میں کوئی دخل نہ دوں گا۔ تو کیا ان معصوم ائمہؑ کے عمل میں تضاد تھا؟ کیا سیرت وکردار میں اختلاف تھا؟ اگر ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ پہلے امام سے لے کر آخری امام تک سب عصمت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ جو ایک کا قول، وہی دوسرے کا، جو ایک کا نظریہ، وہی آخر تک سب کا، نہ ذہن بدلا، نہ قول بدلا، نہ عمل تو اس ظاہری اختلاف پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت من حیث الحکومت، سلطنت اس لئے کہ وہ سلطنت ہے ان کا نقطۂ نظر نہ تھا۔ نہ ان کو زرتار قبائیں درکار تھیں نہ خدم وحشم۔ ان کا مقصد نظام اسلامی کا قیام اور الٰہی قانون کا نفاذ تھا۔ وہ اسی وقت زمام حکومت ہاتھ میں لینا چاہتے تھے جب اللہ کے قانون کو دنیا میں نافذ کرسکیں۔ اور اسلام کے اصول وقواعد کے مطابق سلطنت کرسکیں۔ جب یہ صورت ممکن نظر نہیں آتی تھی تو وہ حکومت سے کنارہ کش اور سیاست ملکی سے علاحدگی اختیار کرلیتے تھے۔

آج جو لوگ علمائے ایران پر یہ اعتراض کررہے ہیں کہ انھوں نے سیاست میں کیوں ٹانگ اڑائی جب کہ ان سے پہلے کے علماء ہمیشہ سیاست سے الگ رہے یا آج جب کہ ایران میں بلند مرتبہ علماء سیاست میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں تو ہندوستانی علماء عملی سیاست سے کنارہ کش کیوں ہیں۔ وہ یہ اعتراض اسلامی نقطۂ نظر سے ناواقفیت وجہالت کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو ایران کے علماء اگر سیاست میں حصہ لے رہے ہیں تو وہ رسالت مآبؐ اور علوی انداز کی پیروی کررہے ہیں۔ اور ہندوستان میں اگر علماء سیاست سے دامن کش ہیں تو وہ امام زین العابدینؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک کے ائمہؑ کی سیرت پر چل رہے ہیں۔

مگر اس دور میں بھی جب کہ ائمہ اہلبیتؑ سیاست سے کنارہ کش اور امور حکومت کے لحاظ سے گوشہ نشین تھے ان حضرات نے اپنے معتمد اور معتبر افراد کو یہ اجازت دے دی تھی کہ حکومت کی ذمہ داری قبول کریں۔ یہاں تک علی بن یقطین جیسے بزرگ مرتبہ صحابی کو مسند وزارت پر متمکن ہونے تک کی اجازت دے دی تھی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ بقدر امکان حکومت کو غلط روی اور ظلم سے بچاتے رہیں اور مظلوموں کی مدد کرتے رہیں۔

آج بھی اگر نقطۂ نظر اقتدار حکومت ذاتی نفع نہ ہو بلکہ مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے دست تعدی کو کوتاہ کرنا اور بقدر امکان حق کی حمایت ہو تو ایسے افراد واشخاص کو جو مذکورہ بالا ارادہ رکھتے ہوں اور ان کو یہ امکان بھی نظر آئے کہ مذکور مقاصد حاصل کرسکیں گے حکومت میں حصہ دار ہونے اور موجودہ سیاست میں حصہ لینے کی شرعی اجازت ہے۔

